(۳۹)

دینی تعلیم وتربیت کی ضرورت

(فرمودہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۳۵ء)

تشہّد ،تعوّذ اورسورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعدفرمایا۔

ہماری جماعت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جوکام مقرر فرمایا ہے اور جن اغراض و مقاصد کو لے کر وہ اس وقت دنیا میں کھڑی ہے، اس کی اہمیت کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ اپنے اور پرائے دونوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور تسلیم کررہے ہیں کہ بہت بڑا کام ہے جو ہماری جماعت اپنے ذمہ ظاہر کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دشمن ہمارے دعووں کو جھوٹا سمجھے یا ہمارے اغراض و مقاصد کو مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے یا ان کی ہمدردی حاصل کرنے کا بہانہ قرار دے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہر شخص خواہ وہ موافق ہو یا مخالف، اس مقصد کو بہت بڑا سمجھتا ہے۔ پس جس مقصد کی اہمیت کا دوست و دشمن قائل ہو ہمیں غور کرنا چاہئے کہ اس کی تیاری کے لئے ہمیں کتنی بڑی مُستعدی اور کس قدر سرگرمی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص جو ہم میں سے دیانتداری کے ساتھ غور کرے یہ امر بخوبی سمجھ سکتا ہے لیکن دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ساری عمر آنکھیں رکھنے کے باوجود نہیں دیکھتے، کان رکھنے کے باوجود نہیں سُنتے اور دل رکھنے کے باوجود نہیں سمجھتے۔ وہ خدا تعالیٰ کی آیات کے پاس سے گزر جاتے ہیں مگر ایسی حالت میں کہ وہ اندھے، بہرے، اور گونگے ہوتے ہیں۔ نہ اپنے خیالات کا خود اندازہ کرسکتے ہیں اور نہ دوسروں تک انہیں پہنچا سکتے ہیں۔ اس قسم کے آدمیوں کا میں ذکر نہیں کرتا بلکہ جو لوگ اپنی عقل کو کام میں لانے کے عادی ہیں، ان کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ وہ اس امر کو سمجھ سکتے ہیں

اور اس کا سمجھنا ان کے لئے بہت آسان بات ہے کہ اس عظیم الشان کام کے لئے جو ہمارے سپرد کیا گیا عظیم الشان تیاری کی ضرورت ہے۔ دنیا میں ہر کام کے لئے کچھ نہ کچھ سامان ہوتے ہیں اور جب تک وہ مہیا نہ ہوں کام نہیں ہوتا۔ اگر ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ کا مالک ہو لیکن وہ جنگل میں ایسے حالات میں مبتلاء ہو جائے کہ روٹی پکانے کے لئے اُسے آٹا میسر نہ ہو۔ فرض کرو جنس اُسے وقت پر نہ پہنچ سکے یا اُس کا مہیا کردہ سامان ضائع ہو جائے۔ چوروں نے اُسے چُرا لیا ہو اور وہ بُھوکا بیٹھا ہو تو اُس کی بھوک کو دور کرنے کے لیے وہ لاکھوں کروڑوں روپیہ اس کے ہرگز کام نہیں آ سکتا ۔ اگر موتیوں کی مالا بھی اس کے پاس موجود ہے تو وہ اس کے کام نہیں آئے گی اس لئے کہ پیٹ بھرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے موتیوں کی مالا یا روپے نہیں بنائے بلکہ آٹا بنایا ہے تو باوجود دولت مند ہونے کے ، باوجود لاکھوں اور کروڑوں روپیہ کا مالک ہونے کے جنگل میں بھوک کے وقت ایسی حالت میں جبکہ کھانے کا کوئی سامان اُس کے پاس نہ ہو، دولت اُسے کام نہیں دے سکے گی اور وہ اپنی خواہش کو پورا نہیں کر سکے گا۔ یا فرض کرو کہ کوئی شخص ملیریا سے بیمار ہے وہ بہت بڑا دولتمند ہے اُس کے پاس کھانے پینے کے بے انتہاء سامان ہیں، آٹے کی بوریاں، گھی کے پیپے، اور موٹے تازے دُنبے بافراط موجود ہیں لیکن یہ ساری چیزیں مل کر بھی اس کے ملیریا کو دور نہیں کرسکتیں۔ بلکہ ملیریا کو دور کرنے کے لئے کونین یا چرائتہ یا ایسی ہی اور اَدویہ درکار ہونگی۔ اور جب تک یہ چیزیں اسے میسر نہ آئیں گی وہ بخار میں مبتلاء رہے گا۔ یا اگر ایک شخص ننگا ہے تو اس کے ننگ کو ڈھانکنے کے لئے اگر ساری دنیا کی دوائیں موجود ہوں تو بھی کام نہیں دے سکتیں۔ قیمتی سے قیمتی اَدویہ، اعلیٰ سے اعلیٰ ٹیکے اور بڑے سے بڑے ہسپتال اگر اس کے لئے موجود ہیں، ہیروں اور موتیوں کا انبار اُس کے سامنے لگا ہوُا ہے تو یہ ساری چیزیں مل کر بھی ایک تہہ بند کا کام نہیں دے سکتیں۔ ہاں اگر گز بھر کپڑا اُسے مل جائے تو وہ اُس کے ننگ کو ڈھانک دے گا۔ یا اگر کسی کو تعلیم کی ضرورت ہو وہ حاجت مند ہوتا ہے ایک علم رکھنے والے اُستاد کا ، اور وہ حاجت مند ہوتا ہے ایک صحیح کتاب کا۔ اگر یہ دو چیزیں اُسے میسر نہ ہوں تو ساری دنیا کی نعمتیں مل کر بھی اس کی یہ ضرورت پوری نہیں کرسکتیں۔ بڑی بڑی فوجیں، عظیم الشان قلعے اور وسیع زمینیں اگر اُسے میسر ہیں ، دولت اُس کے پاس موجود ہے لیکن یہ دو چیزیں نہیں تو وہ علم نہیں سیکھ سکتا۔ ہاں اگر اسے جاننے والا اُستاد اور علم پر مشتمل کتاب مل جاتی ہے تو وہ اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے۔ غرض اللہ

تعالیٰ نے ہر چیز کے حصول کے لئے کوئی نہ کوئی رستہ مقرر کیا ہوا ہے جب تک وہ نہ ملے کام نہیں ہوسکتا ۔ یہ جو میں نے آخری مثال دی ہے اِسی قسم کا کام اِس وقت ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔

ہمارے ذمہ یہ ڈالا گیا ہے کہ ہم تمام دنیا کو خدا تعالیٰ کی باتیں سکھائیں اور وہ پیشگوئی جو رسول کریم ﷺ کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمائی تھی کہ اس کے ذریعہ اسلام ادیانِ باطلہ پر غالب کر دیا جائے گا ،ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کے ایک مثیل یعنی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ پوری ہونے والی ہے۔اب یہ جماعت کا کام ہے کہ وہ ساری دنیا کو اسلام سے واقف وآگاہ کرے اور اسے تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کرے۔پس ہمارے لئے بھی ضرورت ہے ایک کتاب کی اورضرورت ہے ایسے انسانوں کی جو معلّم ہوسکیں ۔کتاب لفظی طور پر ہمارے لئے موجود ہے اور وہ ایسی کتاب ہے جس میں کبھی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا یعنی قرآن مجید۔یہی قرآن مجید رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں ہدایت کا ذریعہ بنا ، یہی قرآن مجید آپ کے بعد کام آیا ، یہی قرآن مجید اب کام آرہا ہے اور یہی قرآن مجید قیامت تک کام آئے گا۔مگر کتاب بھی مفید نہیں ہوسکتی جب تک اُس کتاب کے سمجھنے والے دنیا میں موجود نہ ہوں ۔اور کتاب کے سمجھنے والوں کا وجود بھی اُس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک کتاب کو سمجھانے والے موجود نہ ہوں ۔بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گوعلم رکھتے اور باتوں کوخوب سمجھتے ہیں مگر وہ دوسروں تک علم کو پہنچا نہیں سکتے ۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے علوم بھی مٹ جاتے ہیں جو کتابوں میں تو موجود ہوتے ہیں مگر ان کے سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا ۔ ویدوں کو دیکھ لو، ہزاروں سال سے وہ اسی طرح چلے آرہے ہیں جس طرح آخری تبدیلی کے بعد انکی شکل ہو چکی تھی مگر بعد میں چونکہ قوم کو ان سے دلچسپی نہ رہی اس لئے باوجود اس کے کہ سینکڑوں ہزاروں نسخے وید کے ہندوستان میں موجود ہیں ، ویدوں کو سمجھنے والا کوئی نہیں ۔ پھر ویدوں کا کیا فائدہ ؟ پس چیز موجود ہے خواہ وہ صحیح ہے یا غلط محفوظ ہے یا غیر محفوظ ،محرف ہے یا غیر محرف مگر وہ قوم جو اسے اپنا راہنما سمجھتی ہے باوجود اسے راہنما سمجھنے کے اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتی اس لئے کہ اس کی زبان کے سمجھنے والے دنیا میں موجود نہیں ۔ بیشک بعض لوگ ایسے ہیں جو ویدوں کی زبان سے واقف ہیں مگر چونکہ اب دنیا کے دماغ ترقی کر چکے ہیں اس لئے انہیں ویدوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی اور وہ ان سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے ۔غرض خالی کتاب کا موجود ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ کتاب کے سمجھنے والوں کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے

۔اِسی لئے قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ [1] ہم ہی نے یہ قرآن کریم نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے اس حفاظت سے صرف ظاہری حفاظت مراد نہیں بلکہ باطنی حفاظت بھی مراد ہے یعنی ایسے لوگ دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے جو قرآن کریم کے مطالب کو سمجھیں گے اور انہیں لوگوں تک پہنچانے کی قدرت رکھیں گے۔تو قرآن کریم کا خالی موجود ہونا کافی نہیں جب تک اس کے سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ پھر قرآن کریم کی موجودگی اور اس کے مطالب کو سمجھنے والوں کی موجودگی کے بعد ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سمجھانے والے کا وجود ہے۔دنیا میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے دل میں ایک بات کو خوب سمجھتے ہیں مگر اسے دوسروں تک پہنچا نہیں سکتے اور انہیں وہ طریق معلوم نہیں ہوتے جن سے وہ جلدی اور اعلیٰ طور پر تعلیم دے سکیں ایسا انسان بھی دراصل مفید نہیں ہوتا۔میرے ایک اُستاد ہیں اپنی ذات میں وہ اچھا علم رکھتے ہیں مگر چونکہ ان کے بولنے میں نقص ہے، اس لئے وہ بات کو پورے طور پر سمجھا نہیں سکتے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ایک دفعہ مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں فلسفہ پڑھوں۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ آپ سے میں فلسفہ پڑھنا چاہتا ہوں انہوں نے پڑھانا منظور کر لیا۔جب وہ مجھے فلسفہ پڑھانے کے لئے آئے تو دو تین دن ان سے سبق لینے کے بعد میں نے کہا اب میں کتاب پڑھنا بند کرتا ہوں۔وہ کہنے لگے کیوں؟ میں نے کہا پہلے تو فلسفہ کے متعلق میرے ذہن میں کوئی مفہوم تھا مگر دو تین سبقوں کے بعد وہ بھی جاتا رہا ہے اور اب میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں رہا۔دراصل چونکہ انہیں اپنے مافِی الضمیر کے بیان پر قدرت نہیں تھی اس لئے وہ صحیح طور پر سمجھا نہیں سکتے تھے۔فلسفہ کی بنیاد آگے ہی وہم پر ہوتی ہے ایک وہمی مضمون کو اگر وہمی الفاظ میں بیان کر دیا جائے تو کوئی کیا سمجھ سکتا ہے ۔

اِسی ضمن میں مجھے ایک اور بات بھی یاد آ گئی۔ پانچ سات سال کی بات ہے ہماری جماعت کے ایک دوست کو بخار چڑھا ہوا تھا میں اُن کی عیادت کے لئے گیا۔جب میں وہاں پہنچا تو اتفاقاً وہاں ایک اور دوست بھی بیٹھے ہوئے تھے جنہیں علمِ موسیقی میں مہارت کا دعویٰ تھا اور وہ احمدیت سے پہلے اِس علم کے اچھے ماہر سمجھے جاتے تھے۔اِس علم سے درحقیقت مجھے کوئی مناسبت نہیں یوں تو مجھے ہر علم کا شوق ہے اور کئی علوم جن سے بچپن میں مجھے نفرت ہوا کرتی تھی ، اب مطالعہ کرتے کرتے ان سے

مؤانست پیدا ہوگئی ہے لیکن اس علم سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں۔ لیکن چونکہ وہ اتفاقاً اُس وقت وہاں بیٹھے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ موسیقی کیا شے ہوتی ہے؟ اور میں نے ان سے موسیقی کے اوزان کے متعلق دریافت کیا اور میں نے کہا کہ گو میں نے اِس علم پر کوئی کتاب نہیں پڑھی مگر ذہن میں اس کا کچھ اندازہ کیا ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ اندازہ درست ہے اس لئے آپ مجھے جو پکّا راگ کہلاتا ہے اس کی حقیقت سمجھائیں۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نہ سمجھا شائد اس لئے کہ میرے دماغ کو اس علم سے کوئی مؤانست نہ تھی یا شاید اس کے بیان کی کمزوری کی وجہ سے۔ بہرحال جب وہ اپنی طرف سے سمجھا چکے تو میں نے کہا پہلے تو مجھے کچھ موسیقی کا اندازہ تھا کہ یہ کیا چیز ہوتی ہے مگر اب بجائے زیادہ علم حاصل ہونے کے پہلا علم بھی جاتا رہا ہے۔ تو صحیح طور پر بات نہ بیان کر سکنے والا خواہ خود چاہتا ہو کہ میں دوسرے کو اپنی باتیں سمجھاؤں دوسرے کو سمجھا نہیں سکتا بلکہ اس کے خیالات کو پراگندہ کرتا اور اس کے اوقات کو ضائع کرتا ہے۔ کالج کے تعلیم یافتہ یا فارغ التحصیل طلباء سے جب کسی علم مثلاً فلسفہ وغیرہ کے متعلق باتیں کی جائیں تو پراگندہ خیالات کے سِوا کوئی بات ان کے ذہن میں ٹکی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اور یہ نقص اسی وجہ سے واقعہ ہوتا ہے کہ پڑھانے والے اپنی بات کو سمجھا نہیں سکتے۔ مجھے جب بھی کالج کے طالب علموں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، میں نے نتیجہ نکالا ہے کہ وہ خود کسی بات کو نہیں سمجھتے۔ صرف انہوں نے اصطلاحات رٹی ہوئی ہوتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں اصطلاحات کو رَٹ لینے کے بعد علم پر حاوی ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں علوم تو ہیں مگر ان سے فائدہ کوئی نہیں اُٹھا سکتا۔ وہی علوم غیر ملکوں میں ہیں۔ وہی فلسفہ اور وہی حساب ہے جو ہمارے ملک میں پڑھایا جاتا ہے مگر وہ اسی فلسفہ اور حساب کے نتیجہ میں کئی جدید علوم نکالتے رہتے ہیں۔ اسی حساب کے ذریعہ سائنس کو مدد ملی ہے۔ اور اسی فلسفہ کے ذریعہ علمِ ہیئت کو مدد ملی ہے۔ پہلے فلسفیانہ اصول قائم کئے جاتے ہیں اور پھر سائنس سے ان کی صداقت کا امتحان کیا جاتا ہے۔ گویا پہلے عقل سے جو تھیوری قائم کی جاتی ہے۔ اسے بعد میں تجربات و مشاہدات کی رو سے پرکھا جاتا ہے لیکن ہمارے ملک کے طالب علم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے پروفیسر پڑھانے کے اصول سے ناواقف ہوتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالبِ علم الفاظ تو رَٹ لیتے ہیں مگر حقیقت سے بالکل ناواقف رہتے ہیں۔

تو قرآن کریم کی اشاعت کے لئے بھی دو باتیں نہایت ضروری ہیں۔ایک یہ کہ قرآن کریم سمجھنے والے موجود ہوں اور دوسرے یہ کہ قرآن کریم سمجھانے والے موجود ہوں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی زبان آتی ہو۔لیکن ایک شخص کو اگر زبان آتی ہو اور وہ دروازے بند کر کے بیٹھ جائے تو اِس سے دوسروں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ یا فرض کرو ایک شخص منطق اور فلسفہ جانتا ہے لیکن وہ سارا دن ہل چلاتا رہتا یا سَودا فروخت کرتا رہتا ہے یا اُسے دوسروں کو پڑھانے کی خواہش ہی نہیں تو اُس کے علم سے دوسرے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔تو دوسروں کو علم سکھانے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ انسان کی زبان چلتی ہو بلکہ اور بہت سی باتوں کی ضرورت ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ زبان آتی ہو، یہ بھی ضروری ہے کہ سمجھا سکتا ہو، یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کی خواہش ہو اور وہ اپنے وقت کو دوسروں کی خاطر صَرف کرنے کے لئے تیار ہو، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسی طرز پر کام کرے جو دل نشین ہو اور لوگوں پر اثر انداز کرنے والی ہو۔اچھی سے اچھی بات اگر بے موقع اور بے محل کہہ دی جائے تو بہت بُرا نتیجہ پیدا کر دیتی ہے۔۔حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل اپنے ایک داماد کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایک مجلس میں بیٹھا تھا۔حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل بھی وہیں موجود تھے کہ آپ سے ملاقات کرنے کے لئے ایک مسلمان رئیس آیا۔جس طرح عام مسلمان شریعت کی باریکیوں پر عمل نہیں کرتے ،صرف ظاہری باتوں کا لحاظ رکھتے ہیں،قرآن کریم کا ظاہری طور پر ادب کرنا اور رسول کریم ﷺ کا نام ادب سے لینا وہ اسلام کا ماحصل سمجھتے ہیں اِسی طرح کا وہ رئیس بھی مسلمان تھا مگر چونکہ وہ آدمی مالدار تھا اِس لئے اُسے اپنے وقار کا بھی خیال تھا۔جب وہ مجلس میں آیا تو اُس کا پاجامہ ٹخنوں سے ذرا نیچے تھا۔حضرت خلیفہ الاوّل فرماتے تھے کہ یہ دیکھ کر میرے داماد نے وہ مسواک جو اُس کے ہاتھ میں تھی اُٹھائی اور نہایت عجیب طرز سے منہ بنا کر اُس رئیس کے ٹخنے پر ماری اور کہا۔هٰذَا فِي النَّارِ۔ مطلب یہ کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس کا ازار ٹخنوں سے نیچا رہے وہ حصہ آگ میں جلایا جاتا ہے۔[۲] وہ بڑا آدمی تھا نوکر اُس کے اِردگرد بیٹھے تھے جونہی اُس نے مسواک ماری اُس رئیس کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ کہنے لگا تجھے کس بے وقوف نے بتایا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔اب اپنی طرف سے تو اُس نے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور خیال کیا تھا کہ اس کے نتیجہ میں آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا مگر سمجھانے کا طریقہ نہ جاننے کی وجہ سے اس نے رئیس کی ہتک کر دی۔اور نتیجہ یہ نکلا کہ جو ظاہری

ادب اسلام کا اس رئیس کے دل میں تھا وہ بھی جاتا رہا۔ تو لوگوں کو سمجھانے کا طریق بھی عمدہ ہونا چاہیئے۔ اگر انسان ایسی جہالت سے بات کرے کہ دوسرا اس کی بات کو سمجھ تو جائے مگر تکبر اور غرور کی وجہ سے وہ اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہ ہو تب بھی کیا فائدہ؟ پھر قوتِ عملیہ کی ضرورت بھی ہؤا کرتی ہے۔ اگر سمجھانے والے میں قوتِ عمل نہیں تب بھی اُس کی بات کا لوگوں پر اثر نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص دوسرے کو بُری باتوں سے بچنے کی نصیحت کرتا ہے لیکن اگر وہ خود چوری کرتا، گالیاں دیتا اور لوگوں سے ٹھٹھا کرتا رہتا ہے تو اُس کی بات کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔ وہ اگر کہتا ہے کہ خدا کا ایک مأمور دنیا میں آ گیا، مسیح ومہدی جس کی امتِ محمدیہ کو انتظار تھی قرآنی وعدوں کے مطابق مبعوث ہو گیا تو بیشک لوگ اُس کی بات کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن جب وہ اُس کی عملی حالت کو دیکھیں گے تو اُس کا عمل ان کی ہدایت کے رستہ میں روک بن جائے گا۔

پنجاب کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ دیال سنگھ کالج، دیال سنگھ لائبریری اور ٹریبیون یہ پنجاب میں بہت بڑا علمی کام کرنے والے ادارے ہیں جو برہمو سماج کے قبضہ میں ہیں۔ ٹریبیون ہندوؤں کی طاقت کا زبردست ذریعہ ہے۔ دیال سنگھ لائبریری نہایت مفید کام کر رہی ہے اور دیال سنگھ کالج تعلیمی لحاظ سے اچھی شُہرت رکھتا ہے۔ ان کے بانی دیال سنگھ نامی ایک سکھ سردار تھے انہوں نے جب مذاہب کا مطالعہ کیا تو آہستہ آہستہ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہؤا کہ میرا مذہب مجھے نجات نہیں دے سکتا کسی اور مذہب میں مجھے داخل ہونا چاہیئے اتفاقاً انہیں ایک مسلمان مل گیا جو قرآن کریم سمجھتا اور سمجھا بھی سکتا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ اس سے اسلام کے متعلق واقفیت حاصل کرتے رہے اور آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب میں مسلمان ہوتا ہوں۔ جب یہ خبر لوگوں میں پھیلی تو ایک ہندو جو نہایت چالاک اور ہوشیار تھا ان کے پاس آیا۔ اُس نے چونکہ سمجھ لیا تھا کہ اب دیال سنگھ پر مذہبی دلائل کا اثر نہیں ہو سکتا اس لئے اُس نے چاہا کہ دوسرے چکروں میں ڈال کر انہیں اسلام سے روکا جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مذہب کی تبدیلی سے آپ کا مقصد صرف نجات حاصل کرنا ہے لیکن نجات عمل سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ باتوں سے۔ آپ مسلمان ہونا چاہتے ہیں لیکن آپ یاد رکھیں اِس کا نتیجہ اچھا نہیں بلکہ خراب ہوگا۔ دیکھئے اِس وقت مسلمانوں کی اپنی حالت کیا ہے؟ تعلیم میں وہ سب سے پیچھے ہیں، چور اِن میں زیادہ ہیں، ڈاکو اِن میں زیادہ ہیں، بداخلاق وہ ہیں پھر اگر اسلام

نے مسلمانوں پر اثر نہیں کیا تو آپ اس مذہب سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟ اِن باتوں نے اُن کے دل میں کچھ شبہ پیدا کر دیا۔ مگر وہ آدمی ہوشیار تھا کہنے لگا عوام الناس کا گر جانا اسلام کی خرابی کی دلیل نہیں۔ جب مذہب پر ایک عرصہ گزر جاتا اور تعلیم وتربیت میں کمی آنے لگتی ہے تو ہر مذہب میں اس قسم کے آدمی پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کہنے لگا اچھا اگر عوام کو چھوڑ دیا جائے تو کم از کم کوئی تو اسلام کا نمونہ ہونا چاہئے۔ وہ کہنے لگا ہاں یہ ضروری بات ہے۔ وہ ہندو کہنے لگا اچھا وہ مولوی صاحب جنہوں نے آپ کو تبلیغ کی ہے وہ تو اسلام کا نمونہ ہیں صرف ایک امتحان کیجئے اگر وہ پاس ہو جائیں تو آپ بیشک اسلام قبول کر لیں وہ کہنے لگا کیا امتحان؟ ہندو کہنے لگا جب آپ کے مولوی صاحب آئیں تو آپ سَو دوسَو روپیہ اُن کے آگے رکھ دیں اور اُن سے کہیں کہ مولوی صاحب! آپ کی خاطر میں نے اپنا مذہب چھوڑنا ہے، اپنے رشتہ داروں کو چھوڑنا ہے، اتنی باتیں میں نے آپ کی خاطر کرنی ہیں آپ بھی میری خاطر آج ایک دفعہ میرے ساتھ بیٹھ کر شراب پی لیں پھر تو کبھی اِس چیز کو ہاتھ نہیں لگانا۔ جب وہ مولوی آیا تو سردار دیال سنگھ نے اسی طرح کیا چونکہ مولویوں کی آمدنی کا ذریعہ کوئی اور تو ہوتا نہیں اُس نے خیال کیا کہ ایک دفعہ شراب پینے میں کیا حرج ہے روپے بھی مل جائیں گے اور یہ مسلمان بھی ہو جائے گا اور اس طرح ثواب بھی میرے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا، بیٹھ گیا اور شراب پی لی۔ اُس نے اُسی وقت مسلمان بننے کا ارادہ چھوڑ دیا اور برہمو سماجی ہو گیا اور لاکھوں روپیہ کی جائداد ان کے نام وقف کر دی جس سے وہ اب تک فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ تو لوگ صرف منہ کی باتیں نہیں سنتے بلکہ وہ قوتِ عملیہ کو دیکھتے ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ بنی نوع انسان کے لئے کیا کر رہا ہے۔

احادیث میں آتا ہے رسول کریم ﷺ پر جب پہلی دفعہ وحی نازل ہوئی تو آپ یہ دیکھ کر کہ مجھ پر بہت بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے میں اسے کس طرح ادا کر سکوں گا، گھبرائے اور اپنی اس گھبراہٹ کا حضرت خدیجہؓ سے ذکر کیا کہ اتنا عظیم الشان کام مجھ جیسا کمزور آدمی کہاں کر سکے گا۔ حضرت خدیجہؓ نے جب آپ کی بات سُنی تو چونکہ وہ آپ کے طریقِ عمل کو جانتی تھیں اس لئے انہوں نے کہا آپ تو یونہی گھبرا رہے ہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو چھوڑ دے۔ آپ تو وہ ہیں جو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت اعلیٰ برتاؤ کرتے ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، لوگوں کے بوجھ بٹاتے ہیں اور آپ نے ان نیک اخلاق کو اپنے اندر جمع کیا ہوا ہے جو زمانہ سے مفقود ہیں۔ پھر آپ مہمان

کی عزت اور خاطر و تواضع کرتے اور حق کی راہ میں لوگوں کے مددگار بنتے ہیں کس طرح ممکن ہے کہ خدا آپ کو چھوڑ دے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا یہ بیان بتاتا ہے کہ عملی زندگی ایسی اہم چیز ہے کہ اس سے ہر دوسرا شخص متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت خدیجہؓ مکہ کی تھیں جہاں کے رہنے والے الہام کے قائل نہ تھے۔ غیر قوموں مثلاً یہود اور عیسائیوں سے انہیں ملنے کا کہاں موقع تھا۔ بے شک حضرت خدیجہؓ کے ایک رشتہ کے بھائی ورقہ بن نوفل عیسائی تھے مگر وہ بھی ایک گوشہ نشین آدمی تھے تبلیغی آدمی نہ تھے۔ غرض اسلام سے پہلے الہام اور اس کی حقیقت سے انہیں کوئی آگاہی نہ تھی مگر باوجود اسکے وہ اس نکتہ کو سمجھتی تھیں کہ اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کے لئے اپنی زندگی کو قربان کر دے، اپنی حیات کی تمام ساعات کو خدا تعالیٰ کے دین اور اُس کے جلال کے لئے وقف کر دے تو اُسے خدا ضائع نہیں کرتا۔ کَلَّا وَاللّٰہِ مَایُخْزِیْکَ اللّٰہُ اَبَدًا[۳] خدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا یہ خطرات سب خیالی ہیں خدا آپ کو رُسوا نہیں کر سکتا کیونکہ اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَصْدُقُ الْحَدِیْثَ وَ تَحْمِلُ الْکَلَّ وَ تَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِی الضَّیْفَ وَ تُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ۔[۴] آپ رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک کرتے، سچائی کو اختیار کرتے اور ان اخلاق کو ظاہر کرتے ہیں جو سارے ملک میں مفقود ہیں۔ پھر مہمانوں کی عزت کرتے اور مصیبت زدوں کی امداد کرتے ہیں گویا یہ پانچ باتیں ایسی تھیں جنہوں نے حضرت خدیجہؓ کے قلب پر اتنا گہرا اثر کیا ہوا تھا کہ وہ خیال بھی نہیں کر سکتی تھیں کہ کبھی خدا آپ کو ضائع کر سکتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت بھی آتا ہے کہ جب رسول کریم ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا تو اُس وقت آپ مکہ میں نہیں تھے بلکہ باہر کسی گاؤں میں گئے ہوئے تھے جیسے ہمارے ہاں گھی وغیرہ لینے کے لئے بعض دفعہ آدمی پاس کے گاؤں میں چلا جاتا ہے۔ جب آپ واپس آئے تو آپ ایک دوست کے گھر میں اُسے ملنے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں باتوں باتوں میں اس کی لونڈی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگی۔ ہے! تیرا دوست تو آجکل پاگل ہوگیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کون؟ اُس نے رسول کریم ﷺ کا نام لیا اور کہا وہ کہتا ہے آسمان سے فرشتے مجھ پر نازل ہوتے ہیں اور خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ آپ نے جب یہ بات سنی تو اُسی وقت کھڑے ہوگئے، چادر جو تھوڑی

دیر پہلے کندھے سے اُتاری تھی پھر سنبھال لی اور سیدھے رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور دروازہ پر دستک دی۔ آپ باہر تشریف لائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں نے سنا ہے کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں خدا کے فرشتے آپ پر اُترتے اور خدا کا پیغام دیتے ہیں کیا یہ درست ہے؟ رسول کریم ﷺ نے اِس خیال سے کہ یہ پُرانے دوست ہیں اِنہیں ٹھوکر نہ لگے چاہا کہ اپنی صداقت کے پہلے دلائل پیش کریں مگر رسول کریم ﷺ نے جونہی کوئی دلیل دینی چاہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میں آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ آپ کوئی اور بات نہ کریں آپ صرف یہ بتائیں کہ کیا آپ کا ایسا دعویٰ ہے؟ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہاں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا پیشتر اِس کے کہ آپ اپنی صداقت کی کوئی دلیل دیں آپ گواہ رہیں کہ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ پھر انہوں نے کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! میں دلیلیں سُننا نہیں چاہتا تھا تا کہ میرا ایمان ناقص نہ ہو۔ میں نے آپ کی زندگی دیکھی ہوئی ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ جس شخص نے چالیس سال تک پاکیزہ زندگی بسر کی ہو اور انسانوں پر جھوٹ نہ بولا ہو وہ خدا کے متعلق کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے۔ تو استقلال، ہمت، جُرأت، قربانی، ایثار، عدل اور انصاف ایسی چیزیں ہیں کہ جس انسان میں یہ پائی جائیں اُس کے متعلق انسان شکوک وشبہات میں مبتلاء نہیں رہتا بلکہ اس کی عملی زندگی کا خود مداح بن جاتا ہے۔ ہزار انسان بھی اگر ایک بات کہیں تو اس میں شبہ ہوسکتا ہے لیکن وہ شخص جس کے متعلق ہمیں تجربہ ہو کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا اُس کی بات میں ہم شبہ نہیں کر سکتے تو یہ چیزیں نہایت ضروری ہیں مگر کیا یہ ہم میں پائی جاتی ہیں؟

پہلی چیز قرآن مجید ہے۔ میں مانتا ہوں کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے، میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہمارے ملک کا اکثر حصہ عربی زبان سے ناواقف ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ ایسی ناممکنُ الحصول بات ہے جو کبھی حاصل نہیں ہوسکتی دنیا میں جتنی مذہبی کتابیں ہیں قرآن مجید حجم کے لحاظ سے ان سب سے چھوٹی کتاب ہے۔ گو تمام روحانی علوم اس میں پائے جاتے ہیں اور کوئی ایسی ضروری بات نہیں جو اس میں نہ ہو۔ مگر یہ حجم میں اتنی چھوٹی کتاب ہے کہ بعض کاتب ایک ایک صفحہ میں تمام قرآن شریف لکھ دیتے ہیں۔ کئی لوگوں نے بازوؤں پر تعویذ باندھے ہوئے ہوتے ہیں ان میں ایک صفحہ پر سارا قرآن شریف لکھا ہوا ہوتا ہے تو قرآن مجید کا حجم سب الہامی کتابوں سے چھوٹا ہے۔ اناجیل کا حجم بڑا

ہے، ژنداوستا کا حجم بڑا ہے، بائبل کا حجم بڑا ہے مگر قرآن مجید کا حجم ان کتب میں سب سے چھوٹا ہے جو الہامی ہونے کا دعویٰ رکھتی ہیں۔ پھر اس کے پڑھنے اور سمجھنے میں کیا مشکل ہے؟ ضرورت صرف ارادہ کی ہوتی ہے اگر پختہ ارادہ کرلیا جائے تو کوئی مشکل نہیں رہتی۔ ہم نے کئی لوگوں کو دیکھا ہے انہوں نے بڑی عمر میں قرآن کریم کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا اور آخر پڑھ گئے۔ پس ہر ایک شخص کو چاہئے خواہ وہ بڑی عمر کا ہے کہ قرآن مجید پڑھے۔ اور اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ سمجھتا ہے اب بڑی عمر میں اُس کے لئے قرآن پڑھنا مشکل ہے تو کم از کم اپنی اولاد کو تو پڑھائے۔

پچھلے سال میں نے اعلان کیا تھا کہ نوجوان اپنی زندگیاں خدمتِ دین کے لئے وقف کریں۔ اس پر بیسیوں نوجوانوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا یہ وقف نہایت خوشکن تھا مگر جب وہ یہاں آئے اور یہ پتہ لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو قرآن مجید کا ترجمہ تک نہیں جانتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِس وقت تک ہم صرف چار نوجوانوں کو ممالکِ غیر میں تبلیغ کے لئے بھیج سکے ہیں باقیوں کو ہم قرآن مجید پڑھوا رہے ہیں تاکہ وہ بھی تبلیغ کے لئے تیار ہوسکیں۔ اب بتاؤ کسی کے پاس تلوار نہیں تو وہ لڑے گا کس طرح؟ ہماری تلوار تو قرآن مجید ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا [5] یہ قرآن مجید تمہارے لئے تلوار ہے اس سے جہاد کرو۔ جس شخص کے پاس تلوار نہ ہوگی اور وہ میدانِ جنگ میں چلا جائے گا وہ بجز اپنی گردن کٹوانے کے اور کیا کرسکتا ہے۔ مگر مؤمن کا کام یہ نہیں کہ وہ اپنی گردن کٹوادے بلکہ اس کا کام تو دنیا میں اشاعتِ اسلام کرنا ہے اور ان مسائل کا پھیلانا ہے جو قرآن کریم نے بتلائے۔ اگر صحابہ کو کہا جاتا کہ مؤمن کا کام صرف اپنی گردن کاٹنا ہے تو وہ ایک دن میں ہی ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ دیتے اور اپنے فرض سے عُہدہ برآ ہوجاتے مگر انہیں یہ نہیں کہا گیا بلکہ ان کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ کفار کے دلوں سے گند نکالیں اور انہیں آستانۂ اسلام پر جُھکا دیں۔ یہی کام اب ہمارے سپرد کیا گیا ہے اور اِسی کا نام جہادِ کبیر ہے ورنہ اپنی گردن کاٹ دینا یا دوسروں کی گردن اُتار دینا یہ کونسا مشکل کام ہے۔

پس مسلمانوں کا یہ کام نہیں کہ وہ لوہے کی تلوار سے کفار کا گلا کاٹیں اور نہ صحابہ کے ذمہ یہ کام تھا۔ صحابہ تلوار صرف دفاع کے طور پر اُٹھاتے تھے انہیں اصل حکم یہی تھا کہ فَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ قرآن کریم کی تعلیم کی اشاعت کرو اور اس کے احکام کے ذریعہ کفار سے جہاد کرو۔ پس

ہماری جماعت کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ ہم میں سے ہر شخص قرآن کریم کا ترجمہ اور اِس کا مفہوم جانتا ہو۔ بڑی عمر کے لوگوں کو جانے دو، گو میں نہیں سمجھ سکتا کہ انہیں کیوں جانے دیا جائے وہ بھی اگر پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں لیکن کم از کم آئندہ نسلوں کو تو اِس بات سے محروم نہ رکھو۔ جہاں جہاں ہماری جماعتیں قائم ہیں وہاں کی جماعتوں کو بِالالتزام اپنے بچوں کو قرآن کریم پڑھانا چاہئے اور جہاں اس قسم کا التزام نہیں ہوسکتا وہاں کی جماعتوں کو چاہئے کہ رُخصت کے ایام میں اپنے بچوں کو قادیان بھیج دیں۔ ہم ان کی قرآنی تعلیم کا انتظام کر دیں گے لیکن اگر نہ تو وہ خود اپنی جماعت میں قرآن کریم پڑھانے کا التزام کریں اور نہ چُھٹیوں میں اپنے قرآن کریم پڑھنے کے لئے قادیان بھیجیں تو پھر ہم پر کوئی الزام نہیں ان پر یہ الزام عائد ہوگا کہ انہوں نے ایک اچھے موقع کو ضائع کر دیا۔ پس میں تمام جماعت کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ بچوں کو قرآن کریم پڑھانے کی طرف توجہ کرے۔ باہر بھی ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو قرآن کریم پڑھا سکتے اور اپنے اوقات خرچ کر سکتے ہوں۔ لیکن جہاں قرآن کریم پڑھانے والے نہ مل سکیں وہاں کے لوگوں کو چاہئے کہ مرکز سے ایسے معلّم منگوا لیں۔ مگر یہ نہیں کہ انہیں سال دو سال رکھا جائے بلکہ مہینہ دو مہینے یا تین مہینے میں ان سے قرآن پڑھ لینا چاہئے۔ مجھے حضرت خلیفہ اوّل نے ایک مہینہ میں قرآن کریم ختم کرا دیا تھا لیکن میں کہتا ہوں اگر کوئی ایک مہینہ میں قرآن کریم نہیں پڑھ سکتا تو دو مہینے میں پڑھ لے۔ دو مہینے میں نہیں پڑھ سکتا تو تین مہینے لگا کر پڑھے۔ اِس سے زیادہ وقت تو کسی صورت میں صَرف نہیں ہوسکتا۔ باقی ترقی کے لئے گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ جب رسول کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ دعا مانگا کرو کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔[۶] اے خدا! میرا علم بڑھا تو ہم کون ہیں جو کہہ سکیں کہ ہماری ترقی کے لئے گنجائش نہیں۔ ہاں اتنی استعداد اس عرصہ میں ضرور پیدا ہوسکتی ہے کہ انسان قرآن کریم کو سمجھ لے۔ پھر آگے اس کے علوم کو دنیا میں پھیلانے کا کام ہے، اس کے لئے تربیت کی ضرورت ہے۔ اور یہ بھی ایک اہم کام ہے مگر افسوس کہ ہمارے ملک نے ابھی تک تربیت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ دنیا میں تعلیم دینے والے مل جائیں گے مگر تربیت کرنے والے ڈھونڈنے پر بھی مشکل سے ملیں گے۔ گورنمنٹ نے بھی تعلیم کے لئے بیسیوں کالج کھول رکھے ہیں، سکول اور مدرسے ہیں۔ جے اے وی، ایس اے وی اور بی ٹی کے لئے ٹریننگ دی جاتی ہے لیکن جو سب سے زیادہ نازک کام ہے یعنی تربیت، اس کے لئے کالج نہیں کھولے۔ حالانکہ جب تک نئی

نسلوں میں قربانی کا مادہ نہ ہو، جب تک نئی نسلوں میں ایثار کا مادہ نہ ہو، جب تک نئی نسلوں میں محنت سے کام کرنے کا مادہ نہ ہو، جب تک نئی نسلوں میں صداقت اور راستی نہ ہو، اور جب تک نئی نسلوں میں خلوص اور لِلّٰہیت نہ ہو اور ان امور کے لئے اس کی تربیت نہ کی جائے، اُس وقت تک یہ کام بھلا کس طرح ہوسکتا ہے۔ یہ کام تو اتنا نازک ہے کہ اس کے لئے رات دن ایک کردینا چاہئے مگر جیسا کہ میں نے پچھلے خطبہ میں بھی بیان کیا تھا کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان پانچ چھ گھنٹے مستقل کام کرلیں تو سمجھنے لگتے ہیں کہ انہوں نے ساری دنیا پر احسان کردیا۔ پھر وہ کام کو بوجھ سمجھتے اور اس سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ اپنی عقل سے کام لینے کے عادی نہیں۔ بیوقوفی ان میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ میں بعض دفعہ حیران ہوتا ہوں کہ کیسی معمولی باتیں ہیں جوان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ پھر اگر انہیں نصیحت کی جائے تو وہ ناراض ہوتے ہیں اور اپنی حماقت کو نہیں دیکھتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو سات آٹھ گھنٹہ کام کیا تھا پھر خفگی کیسی۔ اور اس طرح پہلی حماقت کے ساتھ دوسری جواب کی حماقت کو ملا دیتے ہیں حالانکہ بے عقلی سے کام کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ کسی شخص نے ایک ریچھ پالا ہؤا تھا۔ ایک دفعہ جب اُس کی ماں بیمار ہوئی تو وہ ریچھ کو اُس کے پاس بٹھا گیا کہ مکھیاں ہٹاتا رہے۔ اسے یہ خیال نہ آیا کہ ریچھ ریچھ ہی ہے کوئی نقصان پہنچا بیٹھا تو کیسا ہوگا۔ وہ مکھیاں ہٹاتا رہا مگر تھوڑی دیر کے بعد پھر مکھیاں آ بیٹھتیں۔ پھر ہٹاتا پھر آجاتیں۔ آخر آدمی کے ہاتھ اور اس کی عقل اور ریچھ کے ہاتھ اور اُس کی عقل میں فرق بھی تو ہے۔ اگر آدمی مکھیاں ہٹاتا تو مکھیاں ہٹا کر اوپر کپڑا دے دیتا مگر ریچھ کو اِس بات کی سمجھ نہیں تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مکھیاں بار بار آ بیٹھتی ہیں تو وہ ایک بڑا سا پتھر اُٹھا لایا اور جب پھر مکھی آ بیٹھی تو اُس نے اِس زور سے مکھی کو پتھر مارا کہ ساتھ ہی اُس کی ماں بھی رُخصت ہوگئی۔ یہ ریچھ اگر انسان ہوتا اور مکھی مارنے کے بعد اپنے آقا سے کہتا کہ لائیے انعام دیجئے۔ تو کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ آقا اُسے انعام دیتا۔ مگر یہ شخص ریچھ سے بھی زیادہ حماقت کا کام کرتا اور کام کو خراب کرتا چلا جاتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ اسے انعام ملنا چاہئے۔ کیا دنیا کا کوئی انسان ایسا ہے جو دیانت داری سے کہہ سکے کہ ایسے شخص کو انعام ملنا چاہئے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص نماز پڑھنے لگے تو اُلٹا لٹک جائے۔ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر کرلے اور اس طرح نماز پڑھے۔ کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اُس کی نماز ہو جائے گی؟ محض

اس وجہ سے کہ اس نے تکلیف زیادہ اُٹھائی ہے نماز نہیں ہوگی کیونکہ اس نے مقررہ طریق کے مطابق نہیں پڑھی۔ اس کے مقابلہ میں وہ شخص انعام لے جائے گا جس نے آرام اور اطمینان سے نماز پڑھی ہے۔ تو عقل سے کام لینا اور دانائی سے مقررہ فرائض کو سرانجام دینا بھی ضروری ہوتا ہے لیکن میرا تجربہ ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کم عقل ہے۔ تھوڑی تعداد ایسے نوجوانوں کی ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں باقی کبھی عقل کو مدنظر نہیں رکھتے اور نہ سوچ کر کام کرنے کے عادی ہیں صرف اتنا کافی سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کام کے لئے مقررہ وقت دے دیا۔

پھر ایک اور نقص جو ہمارے ملک کے نوجوانوں میں خطرناک طور پر پیدا ہو گیا ہے یہ ہے کہ ان میں عقل کا فُقدان بھی نہیں ہوگا، کام بھی محنت سے کریں گے مگر انجام کی ذمہ واری اپنے اوپر نہیں لیں گے۔ بے شک یہ بات درست ہے اور میں اس کو بیان بھی کر چکا ہوں کہ جب انسان اپنی طرف سے تمام ذرائع کو استعمال کرے اور کام اتفاقاً خراب ہو جائے تو اس کی ذمہ داری اُس پر نہیں ہوتی مگر میں دیکھتا ہوں کہ ۹۹ فیصدی انجام اس کے اپنے اختیار میں ہوتے ہیں اور اگر یہ چاہے تو اس کے خراب انجام سے بدل سکتا ہے مگر بدلتا نہیں۔ صرف ایک فیصدی ایسے فعل ہوتے ہیں جن میں باوجود عقل سے کام لینے کے یہ ناکام ہو جاتا ہے لیکن ۹۹ فیصدی کام کی خرابیوں کی ذمہ داری اس پر ہوتی ہے اور اس کی وجہ تدبیر یا محنت کی کمی ہوتی ہے اگر اس کام کے لئے بارہ گھنٹے محنت کرنے کی ضرورت ہے تو یہ دس گھنٹے کرتا ہے۔ اگر اٹھارہ گھنٹے کام کی ضرورت ہے تو یہ چودہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ بظاہر اس کا دس گھنٹے یا چودہ گھنٹے کام کرنا بہت بڑی محنت نظر آتی ہے مگر خدا کی نگاہ میں یہ محنت نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں محنت وہی ہے جو کام کے لئے ضروری ہو۔ اگر یہ چوبیس گھنٹے کام کرتا اور پھر بھی فیل ہو جاتا تب تو یہ کہہ سکتا کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے کوئی پچیسواں گھنٹہ نہیں بنایا لیکن جبکہ یہ اتنی محنت نہیں کرتا جتنی کام کے لئے ضروری ہے تو اس کی محنت ہرگز ایسی چیز نہیں جس کی تعریف کی جا سکے۔ یہی حال عقل کا ہے کہیں یہ دس فی صدی عقل سے کام لیتا ہے حالانکہ وہاں ۱۵ فی صدی عقل سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، کہیں یہ پندرہ فیصدی عقل سے کام لیتا ہے حالانکہ وہاں بیس فیصدی عقل سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس طرح کام خراب ہو جاتا ہے۔ بیسیوں دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ رات کے بارہ بجے تک بیٹھا رہتا ہے اور کام نہیں ہوتا اور پھر اپنی محنت کا ذکر کرتا ہے۔ حالانکہ

اگر اس کام کے لئے ایک گھنٹہ یا دو گھنٹہ اور جاگنے کی ضرورت تھی اور وہ نہیں جاگا تو اس نے غلطی کی اور وہ خدا کے حضور بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔

ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ایک دفعہ ایک بند میں جو سمندر کے آگے لگایا گیا تھا چھوٹا سا سوراخ ہو گیا۔ یہ ہالینڈ کا واقعہ ہے وہاں سمندر سے زمین نیچی ہے اور لوگ سمندروں کے آگے حفاظت کے لئے بند لگا دیا کرتے ہیں۔ جب اس بند میں سوراخ ہوا تو اُس وقت اتفاقاً ایک چھوٹا سا بچہ وہاں کھیل رہا تھا۔اُس نے خیال کیا کہ اگر میں اِس وقت گاؤں والوں کو اطلاع دینے کے لئے چلا گیا تو یہ سوراخ بہت بڑھ جائے گا اور سیلاب گاؤں کو بہالے جائے گا اِس لئے وہ وہیں بیٹھ گیا اور اُس نے اپنی انگلی سوراخ میں ڈال دی۔نتیجہ یہ ہوا کہ سوراخ بند ہو گیا اور پانی نکلنا رُک گیا لیکن پھر بھی سمندر کا پانی زوروں پر تھا آہستہ آہستہ اُس سوراخ نے پھیلنا شروع کیا۔ جب سوراخ ذرا بڑا ہو گیا تو اُس نے اپنی دوسری اُنگلی بھی اندر ڈال دی۔ پھر سوراخ زیادہ ہوا تو تیسری اُنگلی ڈال دی۔اور جب آہستہ آہستہ سوراخ اور بڑا ہو گیا تو اُس نے اپنا ہاتھ اُس میں ڈال دیا اور سارا دن وہیں بیٹھا رہا۔ پھر شام ہوگئی مگر وہ وہاں سے ہلا نہیں۔نصف شب کے قریب والدین کو خیال آیا کہ ہمارا بچہ کہاں گیا؟ اِدھر اُدھر سے پتہ لگاتے انہیں معلوم ہوا کہ صبح سمندر کی طرف گیا تھا۔خیال آیا کہ کہیں ڈوب نہ گیا ہو اِسی فکر میں جب بند کے قریب پہنچے تو اُنہوں نے دیکھا کہ بچہ نے اپنا ہاتھ سوراخ میں ڈالا ہوا ہے اور خود بے ہوش پڑا ہے۔ اب دیکھ لو اس بچہ نے عقل سے کام لیا اور کام پر اتنا وقت صَرف کیا جتنی ضرورت تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا گاؤں بچ گیا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے آدمی بھی اگر وہاں ہوتے تو دو گھنٹہ کے بعد آجاتے اور کہتے کہ جب اور کوئی نہ آیا تو میں بھی چلا آیا۔ حالانکہ کام میں یہ سوال نہیں ہوتا کہ کتنے گھنٹے خرچ ہوئے بلکہ اگر اسلام اور سلسلہ اور قومی ضرورت اِس بات کا تقاضا کرتی ہو کہ کوئی شخص ایک جگہ بیٹھا رہے اور بیٹھا رہے یہاں تک کہ مر جائے تو اسکا فرض ہے کہ وہ وہاں بیٹھا رہے اور مر جائے۔

غرض ضرورت اِس بات کی ہے کہ محنت سے کام کیا جائے، عقل سے کام لیا جائے اور ایسی تدابیر سے کام لیا جائے جو کام کو کامیاب بنانے والی ہوں۔اور ہر انسان یہ سمجھے کہ نہ صرف اُس نے کام کرنا ہے بلکہ کام کو کامیاب بنانا بھی ہے پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ انجام میرے اختیار میں نہیں وہ کام کی

اہمیت کو نہیں سمجھتا۔ یہ چیزیں ہیں جو بڑوں میں بھی ہونی چاہئیں اور نوجوانوں میں بھی۔ بڑے اگر خود اِن پر عمل نہیں کر سکتے تو نوجوانوں کو سکھانے کے لئے اپنی زبان ہلا سکتے ہیں۔ جیسے گتکا ہے جب گتکا کا ماہر بوڑھا ہو جائے تو گو وہ خود گتکا نہیں کھیل سکتا مگر دوسروں کو کھیلنا سکھا سکتا ہے۔ یا ایک شخص جو بندوق کا اچھا نشانہ لگانا جانتا ہو اگر اس کے ہاتھ میں رعشہ ہو جائے تو گو وہ خود بندوق کا نشانہ ٹھیک نہیں لگا سکے گا مگر اچھا نشانہ لگانے والے پیدا ضرور کر سکے گا۔ اسی طرح قوم پر ایک ایسا وقت آیا کرتا ہے جبکہ اس کے بڑے جو فن کے ماہر ہوں بوڑھے ہو جاتے ہیں اور کام نہیں کر سکتے۔ ایسی حالت میں وہ آئندہ نسلوں کی تربیت کر سکتے اور انہیں اپنا بہتر قائم مقام بنا سکتے ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے کی تعلیم نہایت ادنیٰ تھی مگر آج نہایت اعلیٰ تعلیم ہے۔ یہ اعلیٰ تعلیم کس نے بنائی ؟ اِسی ادنیٰ تعلیم نے بنائی ہے کیونکہ جو پہلے لوگ تھے انہوں نے اپنے شاگردوں کو ایسے اعلیٰ مشورے دیئے کہ وہ ان سے اعلیٰ قابلیت کے مالک ہوئے۔ انہوں نے آگے اپنے شاگردوں کو ایسی قابلیت سے پڑھایا کہ وہ ان سے بھی اعلیٰ قابلیت کے مالک ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ اب اُستاد ادنیٰ اور شاگرد اعلیٰ۔ اگر قانونِ قدرت یہ ہوتا کہ جتنی قابلیت کا اُستاد ہو اُتنی قابلیت کا شاگرد ہوگا تو دنیا کبھی بھی ترقی نہ کرتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ اُستاد میں نقص ہوتا ہے مگر وہ اپنے شاگردوں کو ہوشیار کرتا ہے کہ دیکھنا تم میں نقص نہ آئے۔

مجھے یاد ہے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل ایک دفعہ کوئی بات کہہ رہے تھے کہ دَورانِ گفتگو آپ کی زبان سے ایک سخت لفظ گالی کی قسم کا نکل گیا۔ معاً اُسی وقت آپ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا میاں! ہمیں ایسے اُستاد میسر نہیں آئے جیسے تمہیں ملے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں گالیاں عام تھیں اس لئے کوئی کوئی سخت لفظ ہماری زبان پر اُس وقت کا چڑھا ہوا ہے دیکھنا! تم ایسا لفظ کبھی زبان سے نہ نکالنا۔ تو آئندہ نسلیں اعلیٰ بنائی جا سکتی ہیں اگر توجہ دی جائے، آئندہ نسلیں اعلیٰ بنائی جا سکتی ہیں اگر ان کے سامنے بہترین نمونہ پیش کیا جائے۔ ہم اگر منہ سے کہیں کہ ساری دنیا کو فتح کریں گے، ہم اگر منہ سے کہیں کہ ہم نئی زمین اور نیا آسمان بنائیں گے، ہم اگر منہ سے کہیں کہ ہم شیطانی جال کو کاٹ کر رکھ دیں گے لیکن ہم اعلیٰ نسل نہ تیار کریں ایسی نسل جو اپنی جانوں کو خدا کے لئے قربان کرنے والی ہو، ایسی نسل جو اپنے اوقات کو خدا کے لئے قربان کرنے والی ہو، ایسی نسل جو اپنے اندر عقل رکھتی اور عقل سے کام

لینے کی عادی ہو، ایسی نسل جو اپنی زندگی کا مقصدِ وحید وہی قرار دیتی ہو جس کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام دنیا میں مبعوث ہوئے تو ایسے دعوے کا فائدہ کیا اور لوگوں پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

پس ضرورت ہے کہ آئندہ نسلوں کی تربیت کی جائے، انہیں قرآن کریم پڑھایا جائے، ان میں سلسلہ کے لئے قربانی کی روح پیدا کی جائے اور دیکھا جائے کہ وہ سلسلہ کے لئے کتنا وقت خرچ کرتے اور کتنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ دنیا میں جس طرح اور چیزیں بڑھائی جاسکتی ہیں اسی طرح عقل بھی بڑھائی جاسکتی ہے مگر ضرورت تربیت کی ہوتی ہے۔ اس لئے جماعت اگر ان ذمہ واریوں کو پورا کرنا چاہتی ہے جنہیں میں نے بیان کیا ہے اور جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کی گئی ہیں، اگر وہ دشمنوں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس امر میں مجھ سے تعاون کرے کہ آئندہ نسلوں کی اصلاح کی جائے۔ اگر وہ اس امر پر تیار ہوں اور اس کے لئے عملی جدوجہد کریں تو یہ اتنی بھی مشکل چیز نہیں جتنی کوئی چیز اِدھر سے اُدھر کرنی مشکل ہوتی ہے لیکن اگر وہ اِدھر توجہ نہ کریں تو پھر یہ بہت بڑی مشکل ہے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری جماعت کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنے کی توفیق دے اور ایسی نسل تیار کرنے کی ہمت بخشے جو اُس کی رضا کی راہوں پر چلنے والی اور صِدق، محنت، عقل، اور استقلال سے کام لینے والی ہو۔ اگر ہماری آئندہ نسل قربانی، ایثار، عقل، ہمت اور باقی تمام ضروری ہتھیاروں سے مسلّح ہو جائے تو دشمنوں پر فتح پانا ان کے لئے کوئی مشکل نہ ہوگا۔

(الفضل ۳۱ / اکتوبر ۱۹۳۵ء)

۱؎ الحجر: ۱۰

۲؎ بخاری کتاب فضائل اَصحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ باب قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم لَوۡ کُنۡتُ مُتَّخِذًا خَلِیۡلًا

۳؎ بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء الوحی (الخ)

۴؎ بخاری کتاب التفسیر۔ تفسیر سورۃ اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ

۵؎ الفرقان: ۵۳ ۶؎ طٰہٰ: ۱۱۵